Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:6 (1968)

پاکستان میں اسلامی قانون کا مستقبل

ملک محمد جعفر ایڈووکیٹ

قبل ازیں اس موضوع پر میرے مضمون کی جو دو قسطیں شائع ہوئی ہیں، ان میں میں نے اس سوال کے چند ایک پہلوؤں پر بحث کی ہے کہ کس حد تک یہ ممکن ہے کہ عدلیہ کی طرف سے فقہ کے مستند مآخذ کی آزادانہ تعبیر کے ذریعے پاکستان میں اسلامی قانون میں کوئی تبدیلی کی جائے۔ اس ضمن میں ان مختلف عوامل کا ذکر کیا گیا ہے جن کی وجہ سے عملاً یہ ممکن نہیں ہے کہ ہماری عدالتیں اسلامی قانون کے بنیادی مآخذ اور کتب فقہ کی تعبیر و تشریح میں کوئی قابلِ لحاظ آزادانہ رویہ اختیار کر سکیں۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، اس بارے میں دیگر دقتوں کے علاوہ ایک اور دقّت یہ بھی ہے کہ فی الحال ہماری عدالتوں اور طبقۂ وکلاء کو اسلامی فقہ کے متعلق ایسی علمی مہارت حاصل نہیں ہے جو اسلامی قانون کے عمومی نفاذ کے لئے ضروری ہے۔ بالخصوص جب کہ مقصد یہ ہو کہ اسلامی قانون زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی کیا جائے اور تعزیرات اور ضابطۂ فوجداری و دیوانی جیسے قوانین کے وہ حصے بھی اسلامی شریعت کے احاطہ میں آجائیں، جن پر فقہ کا نفاذ ہمارے ہاں تقریباً گزشتہ ایک صدی سے نہیں ہو رہا۔ اور اسی سلسلے میں اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ملک کی عدلیہ کو یہ قابلیّت حاصل ہو کہ فقہی قواعد کو معاشرہ کے مسلسل تغیر پذیر حالات سے ہم آہنگ بنا سکے۔

لیکن اس مسئلہ کے کئی اور پہلو بھی ہیں جن کی کہ حیثیت بنیادی ہے، اور جن کا تعلق عدالتوں اور وکلاء کی علمی مہارت سے نہیں ہے۔ جہاں تک اسلامی فقہ میں ہمارے ہاں علمی استعداد بہم کرنے کا سوال ہے، اس بارے میں ایک معتدبہ ترقی اور اصلاح نہ صرف ممکن ہے بلکہ اپنی جگہ ایک مستحسن مقصد بھی ہے۔ لیکن یہاں اصولی سوال یہ ہے کہ عدلیہ اور مقننہ میں سے کون سا ادارہ اسلامی قانون کے متعلق زیرِ بحث آئینی مقصد کے حصول

کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ پیش نظر مقصد جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسا جدید قانون نافذ نہ کیا جائے، جو قرآن کریم اور سنت میں بیان کردہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہو اور یہ کہ تمام موجودہ قوانین کو قرآن اور سنت کے مطابق بنایا جائے۔

یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ عدالتوں کا اصل فرض قانون سازی نہیں بلکہ قانون کے نفاذ کو قابل عمل بنانا ہے۔ گو قانون بنانا مجالسِ قانون سازی کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیشہ سے عدالتیں قوانین کی تعبیر کے ذریعہ ایک حد تک قانون سازی کا اختیار بھی استعمال کرتی رہی ہیں۔ قانون سازی میں اس بالواسطہ اختیار کے دائرۂ عمل کی نوعیت کا انحصار کسی ملک کے آئینی نظام پر ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وقتی تقاضے بھی اس اختیار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ صورت میں جو اسلامی قانون ہے، اس کا بیشتر حصّہ عدلیہ کا وضع کردہ ہے۔ اس میں تو کلام نہیں کہ قرآن اور حدیث فقہ کے دو بنیادی مآخذ ہیں۔ لیکن فی الواقع ان دونوں میں قانون کے صرف چند قواعد بیان ہوئے ہیں۔ اسلامی قانون کا باقی حصّہ قضاۃ اور فقہاء کی تعبیر اور قیاس پر مشتمل ہے جن پر کہ اس ابتدائی دَور میں عمل ہوتا رہا، جب کہ اسلامی فقہ مدون کیا جا رہا تھا۔

لیکن عدلیہ کی جانب سے قانون میں اس طرح کی تبدیلی اور ارتقائی عمل میں بعض اصولی نقصانات ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زمانۂ حال کے ماہرینِ قانون عام طور پر اس رائے پر متفق ہیں کہ قانون سازی کے مختلف ذرائع کے باہمی مقابلے میں مقننہ کو دیگر مآخذ اور بالخصوص نظائر پر ایک واضح فوقیت حاصل ہے۔ سرجان سامنڈ نے اپنی کتاب اصولِ قانون (JURISPRUDENCE) کے چھٹے باب میں اس موضوع پر ایک مبسوط بحث کی ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس مسئلے پر فاضل مصنف کی رائے اس کے اپنے الفاظ میں پیش کر دی جائے۔

"مقننہ کے ذریعہ براہِ راست قانون سازی کے فوائد کا اندازہ کرنے کے لئے مناسب ہوگا کہ اس ذریعے کا مقابلہ اس کے سب سے وسیع حریف یعنی عدالتی نظائر سے کیا جائے۔ اس مقابلہ میں مقننہ کے ذریعہ براہ راست قانون سازی کا پہلا فائدہ اس کے عملِ تنسیخ کی وجہ سے ہے۔ مقننہ جس طرح جدید قانون وضع کر سکتی ہے، اسی طرح اُس کے ذریعہ سابق قوانین منسوخ کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن قانونی نظائر صرف جدید قواعد مرتب کرنے کے لئے ہی ایک مؤثر ذریعہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس ذریعہ سے بھی اعلیٰ معیار کے قانون وضع کئے جا سکتے ہیں (بلکہ بعض پہلوؤں سے یہ قواعد اُن قوانین سے بہتر ہوتے ہیں، جو مجالسِ قانون ساز کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں لیکن

قانونی نظائر کے ذریعہ قانون وضع کرنے میں نقص یہ ہے کہ ان کے دائرہ سے تنسیخِ قانون کا عمل خارج ہوتا ہے۔ نظائر کے ذریعہ جو قاعدہ وضع ہو گیا، سو ہو گیا۔ اس طرح اگر ایک غلط قاعدہ بھی قائم ہو جائے تو اس کی تصحیح یا تنسیخ کے لئے کوئی تسلی بخش طریق کار موجود نہیں ہے۔ اس لئے اگرچہ قانون کا ارتقا نظائر کے ذریعہ بھی ممکن ہے لیکن جہاں تک قانون کی اصلاح کا تعلق ہے، اس مقصد کے حصول کے لئے مجالسِ قانون ساز کا کوئی بدل موجود نہیں ہے ..... دوسرا امر جس میں مقننہ کو قانونی نظائر پر فوقیت حاصل ہے، یہ ہے کہ اوّل الذکر ذریعہ قانون سازی پر انحصار کرنے سے مختلف اداروں میں ایک تقسیم کار کی صورت پیدا ہوتی ہے اور اس تقسیم کا نتیجہ بہتر کارکردگی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس صورت میں مقننہ اور عدلیہ میں مکمل علیحدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ادارے کا فرض محض قانون سازی رہ جاتا ہے اور دوسرے کے ذمہ قانون کی تعبیر کرنا اور اس پر عمل درآمد کرانا۔ اور یہ بات بطور ایک عام اصول کے درست ہے کہ عدلیہ کی طرف سے بہترین کارکردگی اسی صورت میں ظاہر ہو گی جب اس ادارے کی ذمہ داری محض قانون کے نفاذ کی نگرانی تک محدود ہو۔ اس کے برعکس اگر قانون سازی کے لئے قانونی نظائر پر انحصار کیا جائے تو تقسیم کار کی صورت ختم ہو جائے گی۔ اور قانون بنانے اور اس پر عمل کرانے کے دونوں کام ایک ہی ادارے کی ذمہ داریوں میں شامل ہو جائیں گے... مقننہ کے ذریعہ وضع کئے ہوئے قانون کا ایک تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس صورت میں تنازعات کے وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی اُن سے متعلقہ قانون کا واضح اعلان ہو جاتا ہے۔ اس طرح مقدمہ کے عدالت میں جانے سے پہلے فریقین کو قانون کے متن کا علم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف قانونی نظائر کی صورت میں مقدمہ کے فیصلہ کے ذریعہ ہی اُس سے متعلقہ قانون کا یہ حصہ وجود میں آتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے پہلے قانون کے اعلان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ مقننہ کے ذریعہ براہِ راست قانون سازی کا طریق انصاف کے اس بنیادی تقاضے کے مطابق ہے کہ اپنے نفاذ سے پہلے قوانین ہر کسی کے علم میں ہونے چاہئیں۔ اور نظائر بعد میں قوانین کے وجود میں آنے کی بناء پر اس عمومی اصول کے منافی ہوتے ہیں۔ .... مجالسِ قانون ساز کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ بطور پیش بینی اُن تنازعات کے تصفیہ کے قواعد مرتب کئے جا سکتے ہیں، جو ابھی فی الواقع رونما نہیں ہوئے۔ اس کے مقابلہ میں عدالتوں کے ذریعہ قانون سازی کے طریق میں قانون وضع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بعینہٖ وہی مقدمہ عدالت کے سامنے آئے جس کے متعلق قانون بنانا مقصود ہے۔ اس طرح نظائر وجود میں آنے کے لئے معین تنازعات کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس کے

مقابلہ میں قانون ساز ادارے اپنے فرائض کی بجا آوری میں مقدمہ بازی کے اتفاقی واقعات سے آزاد ہوتے ہیں۔ غرض اگر قانون سازی کے لئے محض نظائر پر انحصار کیا جائے تو کئی ایسے قانونی نکات اُس وقت تک فیصلہ طلب رہیں گے، جب تک کہ محض اتفاق سے کوئی ایسا تنازعہ عدالت میں لایا جائے جس میں کہ اُس خاص قانون کی وضاحت ضروری ہو۔ اس کے برعکس مقننہ کے عمل سے قانونی خلاء پُر کئے جا سکتے ہیں۔ اور مشتبہ معاملات کی قبل از وقت وضاحت عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں مجلسِ قانون ساز اپنے اختیارات ہر وقت استعمال کر سکتی ہے۔ قطعِ نظر اس کے کہ کسی خاص مقدمہ میں یہ سوال پیدا ہو چکے ہوں یا نہ۔ لہذا نظائر اصلاً ایک غیر مکمل، مبہم اور غیر منظم ذریعۂ قانون ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی ایکٹ میں اس طرح کے نقائص ہوں تو اس کا باعث صرف یہ ہو سکتا ہے کہ متعلقہ مجلسِ قانون ساز کے اراکین نا اہل ہیں یا اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی برت رہے ہیں......

"آخری توجہ طلب امر قانون کی ہیئت کا ہے۔ اس بارے میں بھی مقننہ کو نظائر پر فوقیت حاصل ہے۔ جہاں مقننہ اپنے ایکٹ مجرد قانونی مسائل اور بیانات کی شکل میں منظور کرتی ہے، وہاں نظائر کا قانونی جزو متعلقہ مقدمات کی ٹھوس تفاصیل کے اندر پوشیدہ صورت میں ہوتا ہے۔ اس لئے قانون ساز اداروں کا مرتب کردہ قانون بالعموم مختصر اور واضح ہوتا ہے اور آسانی سے معلوم کیا جا سکتا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف نظائر مقدمات کے ایک ضخیم اور روز افزوں ریکارڈ میں مدفون ہونے کی وجہ سے نظر اور فہم دونوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نظائر کان کا سونا ہیں ـــــ یعنی منوں بے کار مادے کے اندر قیمتی دھات کے چند ذرات ـــــ اور مقننہ سے حاصل کردہ قانون ملک کا چالو سکہ ہے جو بلا تردد ہر وقت استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔" (۱)

قانون سازی کے ضمن میں ان عمومی عوامل کے علاوہ ایک اور خاص امر ایسا ہے جس کا ہمارے موجودہ موضوع سے گہرا تعلق ہے جس کی بنا پر ہمارے لئے مطلق عدالتی ذرائع کی طرف رجوع کرنا خارج از امکان ہے اور اس کی وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ پاکستان میں مروجہ اسلامی قانون کی اصلاح اور اس کے دائرۂ عمل میں توسیع کے مقاصد کے لئے زیادہ تر قانون ساز اداروں پر انحصار کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محولہ بالا مقاصد کے حصول کے

۱۔ اصول قانون، مصنفہ سامنڈ، گیارھواں ایڈیشن، صفحہ ۱۴۵۔

لئے جو اقدام بھی کیا جائے گا اُس سے مروّج فقہ کے قواعد میں متعدد اور اہم تبدیلیاں لازم ہوں گی جس کی بنا پر علماء اور سیاست دانوں کے ایک طبقہ کی طرف سے ایسی ہر کارروائی کی مخالفت کی جائے گی۔ خواہ اس مخالفت کی وجہ مقلدانہ روش پر مبنی ایک پکا مذہبی عقیدہ ہو۔ خواہ یہ مخالفت محض سیاسی اغراض کی وجہ سے کی جائے۔ بہرحال جہاں یہ نہ ہونا چاہیئے کہ اس متوقع مخالفت کے خوف سے ہم قانون کی اصلاح کا پروگرام ترک کر دیں، وہاں مناسب صورت یہی ہے کہ اتنی بڑی اور دُور رس تبدیلیوں کی ذمہ داری خود عوام اُٹھائیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس قسم کی قانونی اصلاح کا کام عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ عمل میں لایا جائے۔

اس مرحلہ پر آئین کی ایک شق کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ شق ایک ایسی روک ہے کہ اس کو راہ سے ہٹائے بغیر کوئی ایسا لائحہ عمل تجویز کرنا ناممکن ہے، جس کے ذریعہ موجودہ قانونی نظام کو اسلام کے مطابق بنانے کے سلسلہ میں کوئی اہم کارروائی کی جا سکے۔

اس موضوع پر اپنے پہلے مضمون میں میں نے مختصراً آئین کے دوسرے باب میں مندرج اُس اصول کا ذکر کیا تھا جس کا تعلق قوانین کو اسلامی تعلیم کے مطابق بنانے کے مقصد کے ساتھ ہے اور ساتھ ہی اُس تشریح کی طرف بھی توجہ دلائی گئی تھی جو اُس آئینی اُصول کا ایک حصہ ہے۔ اب آئین کے اس حصے کے نتائج اور اثرات پر کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا ضروری ہے۔ حوالے کی سہولت کے لئے مناسب ہو گا کہ اس آئینی اصول اور اس کی تشریح کے اصل الفاظ کا ترجمہ بیان کر دیا جائے:۔

"پاکستان میں کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو اُن اسلامی تعلیمات اور اُصولوں کے منافی ہو، جو قرآنِ کریم اور سنّت میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور ملک کے موجودہ تمام قوانین کو قرآن اور سنّت کے مطابق بنایا جائے گا۔

تشریح:۔ مسلمانوں کے کسی فرقہ کے شخصی قانون کے بارے میں اس اُصول کا نفاذ اس شرط کے تابع ہو گا کہ "قرآن اور سنّت" سے مراد قرآن اور سُنت کی وہ تعبیر ہو گی جو اُس خاص فرقے کے ہاں مسلّم ہے۔"

محولہ بالا تشریح میں دو اُمور خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ اس تشریح کی زد میں آنے والے معاملات کے بارے میں قرآن اور سنّت کے متن کی کسی جدید تعبیر کی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔ دوسرا امر یہ ہے کہ خود تشریح اپنے ظاہری الفاظ کی رو سے صرف شخصی قوانین تک محدود ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے،

انگریزی دور میں "شخصی قوانین" کا ایک خاص مفہوم متعین ہو چکا ہے۔ اپنے اصطلاحی معنوں میں شخصی قوانین سے مراد قانون کا صرف وہ حصہ ہے جس کا تعلق ذاتی یا عائلی معاملات سے ہو۔ مثلاً وراثت، وصیت، ہبہ، نکاح، طلاق اور بلوغت وغیرہ۔ قانونی تعبیر کے عام اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے قیاس یہی ہے کہ آئین میں "شخصی قوانین" کے الفاظ اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔

یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ کس طرح ہمارے ہاں غیر ملکی حکمرانوں نے اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ شخصی اور خاندانی معاملات کے متعلق مقدمات کا فیصلہ فریقینِ تنازعہ کے مذہبی قانون کے مطابق کیا جائے۔ پنجاب لاز ایکٹ مجریہ ۱۸۷۲ء ایک ایسے ہی قانون کی مثال ہے جس کے تحت مذہبی احکام کے اطلاق کی گنجائش قائم رکھی گئی تھی۔ انگریز حکمرانوں کی جانب سے قانون کی یہ تقسیم جس کی رو سے شخصی آئین کو ایک خاص حیثیت دی گئی تھی، ایک ایسی پالیسی ہے جس کی وجوہات سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ لیکن پاکستان کے آئین میں اسلامی مقصد کے ضمن میں ان تشریحی الفاظ کا اضافہ ایک ایسا عجیب معاملہ ہے جس کی حکمت آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی۔

کیا آئین کے اس حصے میں "شخصی قوانین" کے الفاظ کے استعمال سے یہ مقصد ہے کہ فرقہ وارانہ فقہی قواعد کے عمل کو شخصی اور عائلی تنازعات کے دائرے تک محدود رکھا جائے گا اور قانون کا دیگر تمام حصہ اس پابندی سے آزاد سمجھا جائے گا۔ اگر یہ صورت ہو تو قانون کے ایک بہت بڑے حصے کی خالص اسلامی اور غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر اصلاح اور تدوین ہو سکتی ہے۔ لیکن آئین کی اس زیر بحث شق کا مقصد اس کے بالکل الٹ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ اسلامی اصول کے ہمہ گیر الفاظ کے باوصف اصل مقصد یہ ہے کہ قانون کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانے کا پروگرام فی الواقع ان معاملات تک محدود رکھا جائے گا جو معروف شخصی قوانین کے مختصر اور نسبتاً غیر اہم فہرست میں شامل ہیں۔

مؤخر الذکر صورت میں ظاہر ہے کہ فرقہ بندی پر مبنی موجودہ فقہی قواعد کے مطابق ہر فرقہ کے اپنے تنازعات کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور ان سے متعلق مروج اسلامی نظامِ قانون میں کسی اہم تبدیلی کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ آئین کی اس شق کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ اسلامی قانون کے دائرۂ عمل کو اس حد تک محدود رکھا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قانون کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانے کے مقصد کو فرقہ وارانہ فقہ کے قواعد کی پابندی کے ساتھ مشروط کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے؟ اس بارے میں

سب سے پہلے یہ صراحت ضروری ہے کہ اس شق کو موجودہ آئین میں شامل کرنے کی ذمہ داری اس آئین کے مصنف پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں مجموعۂ قانون کو اسلام کے مطابق بنانے کا مقصد آئین کے بارہویں حصے (باب نمبر ۱) میں مذکور تھا۔ اس باب کے آرٹیکل ۱۹۸ کے الفاظ یہ تھے:۔

"پاکستان میں کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو اُن اسلامی احکام کے منافی ہو جو قرآنِ کریم اور سنت میں مذکور ہیں اور موجودہ قوانین کو ان احکام کے مطابق بنایا جائے گا۔

تشریح:۔ اس آرٹیکل کو کسی اسلامی فرقہ کے شخصی قانون پر نافذ کرنے کے معاملہ میں قرآن اور سنّت کی صرف وہ تعبیر کی جائے گی جس کا وُہ خاص فرقہ پابند ہے"

اس سے واضح ہے کہ معنوی لحاظ سے سابق آئین کے اس آرٹیکل کا منشاء بالکل وہی ہے، جو موجودہ آئین کے متعلقہ حصّے کا ہے۔ اختلاف صرف الفاظ اور ایک حد تک طریقِ کار کا ہے۔ لیکن اختلاف کے یہ تفصیلی امور ہمارے موجودہ موضوع سے غیر متعلق ہیں۔ جہاں تک "قرآن اور سنّت" کے الفاظ کی اُس تشریح کا تعلق ہے جس کی رُو سے فرقہ وارانہ تعبیر کی پابندی لازمی قرار دی گئی ہے سابق اور موجودہ آئین میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہ بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ابتداء میں اصولی مقاصد کا پیراگراف نمبر ا ۱۹۶۲ء کے آئین کا حصہ نہ تھا۔ بظاہر اُس وقت یہ کافی سمجھا گیا کہ آئین میں بطور ایک اصولی مقصد اس بات کا عہد کر لیا جائے:۔

"پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے زندگی کے متعلق اسلام کے بنیادی اصولوں اور نظریات پر عمل پیرا ہونے کے قابل بنایا جائے گا اور مسلمانوں کے لئے ایسے ذرائع مہیا کئے جائیں گے، جن کی مدد سے وہ اسلامی نظریات کی روشنی میں زندگی کے مقصد کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں"

بعد میں ۱۹۶۴ء میں ایک ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ اس زیرِ بحث شق کو آئین کا حصہ بنایا گیا جس کی رو سے بالصراحت اس عزم کا اعلان کیا گیا کہ تمام قانونی نظام کو قرآن کریم اور سنّت کے احکام کے مطابق بنایا جائے گا۔

جیساکہ معلوم ہے، محولہ بالا ایکٹ کے پاس ہونے سے پہلے آئین کی مجوزہ ترمیم کا مسودہ خاصی شدید سیاسی بحث کا موضوع بنا رہا۔ آئین کی اس مجوزہ ترمیم کا اصل مقصد یہ تھا کہ بنیادی حقوق کو آئین میں شامل کیا جائے۔ بل سرکاری پارٹی نے پیش کیا تھا لیکن اُس وقت اس پارٹی کو قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل نہ تھی جو آئینی ترمیم کو منظور کرانے کے لئے ضروری تھی۔ ترمیم کے حق میں دو تہائی تعداد میں اراکین کی تائید حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ حزبِ اختلاف کے چند ممبر بھی اس معاملے میں سرکاری جماعت کا ساتھ دیں۔ اس غرض کے لئے سرکاری پارٹی کو کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ لیکن آخری وقت تک یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی کہ آیا بل پاس کرنے کے لئے اراکین کی کم از کم اتنی تعداد میں حمایت حاصل ہو سکے گی یا نہیں جو قانوناً اس ترمیم کو آئین کا جزو بنانے کے لئے ضروری تھی۔ بالآخر ایک مصالحتی فارمولے کے ذریعہ بل کے پاس ہونے کا امکان پیدا ہُوا۔ ـــــــ اس مصالحتی فارمولے کے تحت مقاصد کے ضمن میں اسلامی قانون کا وہ اصول آئین میں شامل کیا گیا، جو اِس وقت زیرِ بحث ہے۔ اسی طرح سرکاری اور مخالف پارٹیوں کی مفاہمت کا ایک حصہ یہ بھی قرار پایا کہ بل میں بعض اور ترمیمیں بھی شامل کی جائیں جن کا مقصد آئین کو زیادہ واضح اور گہرا مذہبی رنگ دینا تھا۔ مثال کے طور پر مملکت کے نام کی "جمہوریہ پاکستان" سے "اسلامی جمہوریہ پاکستان" میں تبدیلی ان مؤخرالذکر تجاویز کا ایک حصہ تھی۔ اسی طرح اس فارمولے کے تحت آئین کے اُس حصے میں بھی چند تبدیلیاں کی گئیں جن کا تعلق اسلامی مشاورتی کونسل کے فرائض اور طریقِ کار سے ہے۔

ترمیمی ایکٹ کا یہ مختصر سا تاریخی پسِ منظر یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ کن حالات میں اسلامی قانون سے متعلقہ اصولی مقصد موجودہ آئین کا جزو بنا۔ اس تبدیلی سے اس ضمن میں ۱۹۵۶ء کے آئین والی پوزیشن بحال کر دی گئی ہے۔

جب ترمیمی بل ایوان میں زیرِ بحث تھا تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلامی قانون سے متعلق محولہ بالا اصولی اعلان اور اس نوع کی چند دیگر دفعات کو آئین میں شامل کرانے میں اسمبلی میں ایک قلیل التعداد مذہبی گروہ کی مساعی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ پارٹی مُصر تھی کہ وہ اصل بل کی تائید صرف اس شرط پر کرے گی کہ بل میں ان دفعات کو بھی شامل کیا جائے جو یہ اراکین بزعمِ خود آئین کو اسلامی بنانے کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ جیساکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، ترمیمی بل کا اصل مقصد بنیادی حقوق کو عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ قابلِ نفاذ بنانا تھا جیساکہ سابقہ آئین میں پوزیشن تھی۔

یہاں اُس سیاسی صورتِ حال کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا جس کی وجہ سے ۱۹۵۶ء کے آئین کی دفعہ ۱۹۸ میں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلامی قانون کے ضمن میں "قرآن اور سنّت" کے الفاظ کے ساتھ اس توضیحی شرط کا اضافہ کیا جائے کہ ان الفاظ کی صرف وہ تعبیر کی جائے گی جو کسی تنازعہ کے فریقین کے اپنے فرقہ وارانہ فقہ میں بیان کی گئی ہے۔

۱۹۵۶ء سے پہلے ایک لمبے عرصہ تک آئینی تجاویز ملک کی دو آئین ساز اسمبلیوں کے سامنے یکے بعد دیگرے زیرِ غور رہیں۔ اس عرصہ میں علماء کی طرف سے یہ مطالبہ زور پکڑتا رہا کہ آئین میں اس امر کی ضمانت رکھی جائے کہ موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق بنایا جائے گا اور آئندہ کے لئے ملک کے کسی قانون ساز ادارے کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ کوئی ایسا قانون وضع کرے جو کسی اسلامی حکم کے خلاف ہو۔ اصولاً کوئی اس مطالبے کی مخالفت نہ کر سکتا تھا لیکن ساتھ ہی دونوں آئین ساز اسمبلیوں کے اراکین کی اکثریت کو یقین تھا کہ اگر مقصد یہ ہے کہ ملک میں اس وقت نافذ العمل ضخیم مجموعۂ قانون کو کلیتہً اسلامی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے تو اس کے لئے لازم ہوگا کہ مجالسِ قانون ساز یا عدالتوں کو اسلامی قانون کے بنیادی مآخذ کے بارے میں جدید تعبیر اور تصرّف کے وسیع اختیارات حاصل ہوں۔ لیکن علماء اس بات پر قطعاً رضامند نہ تھے کہ عدلیہ یا مقننہ میں سے کسی کو اس طرح کے اختیارات دیئے جائیں۔

ہم مانتے ہیں کہ اس بارے میں علماء کے خدشات بلحاظ اپنے عقیدہ اور مفاد بالکل جائز اور حقیقی تھے عقیدتاً علماء اپنے اس پختہ نظریہ پر قائم تھے کہ فقہ کے مآخذ کے متعلق تعبیر کے تمام مسائل پُرانے زمانے کے آئمہ نے قطعی طور پر حل کر دیئے ہیں۔ اور اب آئمہ کی رائے سے اختلاف کرنے کا اختیار کسی ادارے کو حاصل نہیں ہے خواہ اس ادارے کی ہیئت مذہبی ہو یا سیکولر۔

ان مذہبی حلقوں سے بے انصافی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ علماء کے خود اس عقیدے کی تہ میں اُن کی کوئی ذاتی اغراض تھیں۔ اس خیال کو رد کرنے کے لئے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ فقہ کے مآخذ کی جدید تعبیر کے بارے میں عدم اختیار کا نظریہ مسلمانوں میں عمومی طور پر پایا جاتا ہے اور ظاہر ہے علماء اپنے محدود حلقہ کو اس عمومی رائے سے مستثنیٰ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن اتفاق سے یہاں صورت یہ تھی کہ علماء کا یہ عقیدہ اُن کے ذاتی اور جماعتی مفاد کے عین مطابق تھا۔ اگر اسلامی قانون کی تشکیلِ نو کا اختیار عدلیہ یا مقننہ کے سپرد کر دیا جائے تو اس بات کا قوی احتمال ہے کہ یہ ادارے اسلامی قانون میں ایسی اہم تبدیلیاں عمل میں

لے آئین کہ یہ قانون اپنی ہیئت اور مضمون کے لحاظ سے ایسی شکل اختیار کرے جس سے علماء اپنے آپ کو تقریباً ناشناس پائیں۔ اور یہ صورت لازماً علماء کے اُس منصب پر اثر انداز ہوگی جس کے تحت وہ عوام کو کم از کم نکاح اور طلاق وغیرہ کی قسم کے اُن شخصی معاملات پر مشورہ دے سکتے ہیں جن کا تصفیہ اس وقت فرقہ وارانہ مستند فقہ کے قواعد کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ سیاسی حالات تھے جن میں مجلسِ آئین ساز کے فاضل اراکین کو اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنا تھا۔ چنانچہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ حل ایسا ہونا چاہیئے کہ ملک کے زیادہ سے زیادہ طبقے اس سے مطمئن ہونا چاہئیں۔ سب سے اہم پیشِ نظر خیال یہ تھا کہ کوئی ایسا حل تجویز نہ کیا جائے جو علماء کی ناراضگی کا موجب ہو، کیونکہ اس بات سے تمام سیاست دان باخبر تھے کہ ایسے معاملات میں علماء کا عوام پر کس قدر اثر ہے۔

ان عوامل کی روشنی میں جو حل تلاش کیا گیا وہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے آرٹیکل ۱۹۸ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس آرٹیکل میں ایک طرف تو اس ارفع اور دُور رس پروگرام کا اعلان کیا گیا کہ ملک کے "تمام قوانین کو قرآن کریم اور سنت میں بیان کی ہوئی اسلامی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے گا" اور دوسری طرف "قرآن اور سنت" کے الفاظ کے معانی کے متعلق ایک ایسی تشریح کا اضافہ کر دیا گیا جس پر اگر عمل کیا جائے تو اسلامی قانون کے ارتقاء اور اُس کی تشکیلِ نو کا راستہ قریباً مسدود ہو جائے گا۔

اب آئین کے پہلے ترمیمی ایکٹ مجریہ ۱۹۶۴ء کی رُو سے موجودہ آئین میں بھی اسلامی قانون کے ضمن میں قرآن اور سنت کے الفاظ کی یہ تشریحی شق جوں کی توں شامل کر لی گئی ہے اور کسی نے ترمیم کے اس حصے کے نتائج و عواقب پر غور نہیں کیا۔ یاد رہے کہ ان نتائج کو نظر انداز کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ قرآن اور سنت کے متعلق تشریحی شق ایک نہایت اہم معاملہ ہے۔ اس کی رو سے اسلامی قانون کے متعلق آئین کے اصولی مقصد کا دائرۂ عمل نہایت درجہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک تو قانون کے اُن شعبوں کو ذہن میں رکھا جائے جو شخصی قوانین کے نام سے موسوم ہیں اور ساتھ ہی یہ دیکھا جائے کہ ان شخصی قوانین کے بارے میں مختلف فرقوں کے فقہی قواعد میں باہم کس حد تک اختلاف اور تضاد ہے۔

پہلے سوال کے ضمن میں شروع میں ہی یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ بنیادی طور پر "شخصی قوانین" کا تصور قانون کے مختلف شعبوں کی ایک مصنوعی تقسیم پر مبنی ہے۔ بظاہر اس تقسیم کا مقصد قانون کی پرائیویٹ

اور پبلک قسموں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنا ہے۔ اور یہ تقسیم اِس اصول کے تحت کی جاتی ہے کہ شخصی قوانین وہ ہیں جن سے مملکت کے کوئی مفاد وابستہ نہیں ہیں۔ یا اگر کوئی ایسے مفاد ہیں تو اُن کا تعلق اتنا بعید اور بالواسطہ ہے کہ حکومت کو ان امور میں دخل انداز نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن آج کل جب کہ مملکت کا رفاہی تصوّر سرعت کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے، شہریوں کی زندگی کا شائد ہی کوئی ایسا شعبہ باقی رہ گیا ہے جس میں حکومت کو جائز طور پر دلچسپی نہ ہو۔ اس لیئے انگریزی دورِ حکومت کے مقابلے میں اب خالص شخصی قوانین کا دائرہ بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

اس مضمون میں ہم قارئین کی توجہ بعض ایسے امور کی طرف دلائیں گے جو کچھ عرصہ پہلے شہریوں کے ذاتی اور خاندانی معاملات سمجھے جاتے تھے اور مملکت اُن میں مداخلت نہ کرتی تھی، لیکن اب بدلے ہوئے معاشرتی تقاضوں کی وجہ سے حکومت ان معاملات کے متعلق قانونی پابندیاں نافذ کر رہی ہے۔

یہاں صرف یہ ذکر کر دینا کافی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حکومت کے لئے اپنے قانون سازی کے اختیارات کو وسعت دینے کی اس پالیسی کا آئین میں مکمل جواز موجود ہے۔ اس ضمن میں آئین کی تمہید کے تیسرے پیراگراف کا مضمون غور طلب ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ

" پاکستان کے باشندے اپنے اس عزم کا اعلان کرتے ہیں کہ

(ا) ....

(ب) مملکتِ پاکستان اپنی پالیسی میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اُن اصولوں پر کاربند رہے گی جو دینِ اسلام نے مقرر کیئے ہیں، اور

(ج) پاکستان کے مسلمانوں کے لئے ایسے اسباب مہیا کیئے جائیں گے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اُن اسلامی تعلیمات کے مطابق بنا سکیں جو قرآن کریم اور سنّت میں بیان ہوئی ہیں "

ضمناً اس مرحلہ پر فرقہ وارانہ قوانین کے متعلق آئین کے دو حصوں میں ایک طرح کا تضاد قابلِ ملاحظہ ہے۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے، آئین کے پہلے ترمیمی ایکٹ کے ذریعے فرقہ وارانہ شخصی قوانین کے تحفظ کے لئے متعلقہ اصولی مقصد میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ قرآن اور سنّت کی تعبیر کے بارے میں مختلف فرقوں

کے موجودہ فقہی قواعد سے انحراف نہ کیا جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس تمہید کے الفاظ عمومی اور ہمہ گیر ہیں اور ان کے ذریعے یہ مقصد واضح طور پر متعین ہو چکا ہے کہ پاکستان کے مسلمان اپنی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں شعبوں میں قرآنِ کریم اور سُنّت کے احکام کو نافذ کریں گے۔ یہاں یہ شرط ضروری نہیں سمجھی گئی کہ ان احکام کی تعبیر کے معاملہ میں فرقہ وارانہ اصولوں کی پابندی لازمی ہوگی۔ اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں کہ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں اسلامی تعلیمات کے نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن اور سنت کے شرعی احکام کے مطابق بنایا جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اپنے معروف مفہوم کے لحاظ سے "شخصی قوانین" کی حدود کیا ہیں۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ ان قوانین کے متعلق مختلف فرقوں کے فقہ میں باہم کس قدر اختلاف ہے۔

لیکن آگے چلنے سے پہلے ایک امر کی وضاحت ضروری ہے۔ فقہ کے صرف چند مسائل ایسے ہیں جن کی بنیاد براہِ راست قرآن کے کسی حکم یا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کسی حدیث پر ہے۔ چونکہ سنت اور حدیث کے الفاظ عام طور پر مترادف معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ اسلامی قانون کے متعلق آئین کے اصولی مقصد کے الفاظ سے یہ تاثر پیدا ہو کہ اس اصول کی تشریح کا اطلاق فقہ کے ایک نسبتاً قلیل سے حصہ پر ہے یعنی جس کی سند خود قرآنِ کریم کی آیات ہیں یا حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور یہ کہ فقہ کے باقی حصے کے متعلق ملک کے قانون ساز ادارے اس کے پابند نہیں ہیں کہ قانون وضع کرنے میں ہر فرقہ کے اپنے مخصوص قانون کو جوں کا توں بحال رکھیں۔ لیکن علماء کی اکثریت کے نزدیک (اور ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں علماء کی رائے ہی وقیع سمجھی جائے گی)، سنت کا مفہوم حدیث سے وسیع تر ہے۔ حدیث سے مراد صرف نبی کریمؐ کا قول یا عمل ہے لیکن لفظ "سنت" میں علاوہ احادیثِ رسولؐ کے وہ نظائر بھی شامل ہیں جو صحابہ کرام اور آئمہ کے اقوال اور طرزِ عمل سے ماخوذ ہیں۔

شخصی قوانین کی دو بڑی اقسام ہیں۔ اول وہ جن کا تعلق جائداد سے ہے۔ مثلاً وراثت، وصیت، ہبہ، وقف، تقسیم اور انتقالِ جائداد وغیرہ۔ اور دوسری قسم ازدواجی اور عائلی معاملات سے متعلق ہے۔ اور اس میں نکاح، مہر، طلاق، بلوغت، تولیت اور حقِ گذارہ وغیرہ کے قوانین شامل ہیں۔ (مسلسل)